افکار

(۱)

{ پچھلے دو ماہ سے ہم "فکر ونظر" کے متعدد قیمتی صفحات ماہنامہ "بینات" میں ایک فرضی نام سے شائع شدہ مضمون "فضل الرحمٰن کی تحقیقِ ربوا کی حقیقت" کی نذر کر رہے تھے۔ ہمیں اتمام حجت منظور تھا۔ ورنہ قارئین کرام نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ اس مضمون کا علمی معیار اور اس کا لب ولہجہ ہرگز اس لائق نہ تھا کہ وہ ان کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ اس مضمون میں بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ کتابوں کے بالکل غلط حوالے اور تحریف شدہ ترجمے پیش کئے گئے ہیں اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کی طرف وا دین میں ایسی عبارتیں منسوب کی گئی ہیں جو سراسر من گھڑت ہیں۔ ہم دل پر جبر کر کے اور قارئین کرام سے معذرت چاہتے ہوئے اس مضمون کی دو قسطیں شائع کر چکے ہیں۔ پہلی ہی قسط پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے ماہنامہ "بینات" کے عالم متقی اور ثقہ ارکانِ ادارہ کی توجہ اس مضمون کی تحریفات کی طرف مبذول کرائی تھی۔ ہمیں امید تھی کہ یہ محترم حضرات فرضی نام سے لکھنے والے اطفالِ مکتب کی دل آزار تحریروں کو اوّلاً اپنے موقر رسالہ میں جگہ نہ دیں گے اور اگر اس پر کسی دینی مصلحت کی وجہ سے انہیں اصرار ہی تھا تو اب اس کی ذمہ داری قبول کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ تادم تحریر رسالہ "بینات" یا مدرسہ عربیہ اسلامیہ (نیو ٹاؤن کراچی) جس کا یہ رسالہ ترجمان ہے، ان دونوں موقر اداروں میں سے کسی کا کوئی ذمہ دار رکن فرضی نام سے تین طویل

قسطوں میں شائع کردہ مضمون کی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ممکن ہے ایسا کرنا ان کے نزدیک تقویٰ کے خلاف ہو۔ بہرحال، ایسی صورت میں ہمارا "فکر و نظر" کے صفحات پر اس مضمون کو نقل کرنے پر اصرار کرنا قارئین کرام کے ساتھ سخت ناانصافی ہوگی۔ اس لئے ہم اس کی اشاعت ملتوی کرتے ہیں تاوقتیکہ رسالہ "بیّنات" یا مدرسہ اسلامیہ عربیہ کے کوئی رکن یا ان کے ذمہ دار ہوا خواہ اس مضمون کی (مع اس کی تمام تحریفات کے) ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔ مدیر]

(۳)

[ماہنامہ "طلوع اسلام" نے اپنی اشاعت بابت مارچ ۱۹۶۴ء "تحقیق ربوا" کی نذر کی تھی جس کے لئے ہم ممنون ہیں۔ یہ مقالہ سارا کا سارا نقل کرنے کے بعد اس پر مندرجہ ذیل تبصرہ شائع کیا گیا تھا۔ اس تبصرہ پر ہمارا مختصر اظہار خیال "افکار" کے اختتام پر ملاحظہ فرمایئے۔ مدیر]

محترم ڈاکٹر صاحب کا مقالہ بڑی تحقیق اور کاوش سے لکھا گیا ہے جس کے لئے ہم انہیں مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ قرآن کی رو سے ربوا کی واضح تعریف، جو ان کے بالکل سامنے پڑی تھی ان کی نگاہوں سے اوجھل رہی جس کی وجہ سے وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ قرآن نے صرف (مروجہ الفاظ میں) سود در سود (یا سود مرکب) کو حرام قرار دیا ہے سادہ سود کو نہیں۔

قرآن کی رو سے ربوا کی تعریف قرآن کی رو سے ربوا کی جامع اور مانع تعریف ان چار الفاظ کے اندر موجود ہے۔ جو سورۂ بقرہ کی آیت ۲۷۹ میں آئے ہیں اور جنہیں ڈاکٹر صاحب نے بھی درج کیا ہے یعنی

وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ — اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لئے تمہارا راس المال ہے۔

سابقہ آیت میں کہا گیا ہے کہ اگر تم ربوا لینے سے باز نہ آئے تو اسے خدا اور رسول کے خلاف بغاوت سمجھا جائے گا۔ اس کے بعد مندرجہ بالا آیت میں کہا ہے کہ اگر تم ربوا لینے سے باز آجاؤ اور توبہ کرو تو تم اپنا اصل زر واپس لے لو اس کے بعد ہے۔ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ۔ (۲/۲۷۹)۔ اس سے نہ تم کسی پر ظلم کرو گے نہ تم پر ظلم ہوگا۔ اس سے واضح ہے کہ

(۱) اگر صرف اصل زر واپس لیا جائے تو اس سے مقروض پر ظلم نہیں ہوتا۔

(۲) اگر اصل زر سے کچھ بھی زیادہ لیا جائے تو یہ مقروض پر ظلم ہو گا۔

اسی کا نام ربوا ہے۔ یعنی زر اصل سے کچھ بھی زیادہ لینا۔ کہئے کہ اس میں کوئی الجھاؤ۔ کسی قسم کا التباس۔ کوئی شک وشبہ کوئی دشواری یا مشکل ہے؟

۲۔ ڈاکٹر صاحب نے جو یہ کہا ہے کہ سود در سود (سود مرکب) تو حرام ہے لیکن سود مفرد حرام نہیں، تو یہ نتیجہ بوجوہ غلط ہے۔ یہ نتیجہ انہوں نے حسب ذیل آیت سے نکالا ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَہ (۳/۱۲۹)۔ (اس کا ترجمہ انہوں نے کیا ہے)۔ اے ایمان والو! یہ دو چند سہ چند ہونے والا ربوا کھانا چھوڑ دو۔

امام راغب نے کہا ہے کہ اس آیت میں مُضَاعَفَۃً دراصل ضَعْفٌ سے ہے جس کے معنی "کم کرنے" کے ہیں۔ ضِعْفٌ سے نہیں جس کے معنی بڑھانے کے ہیں۔ لہٰذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ ربوا جسے تم سمجھ رہے ہو کہ اپنے روپے کو بڑھانا ہے، بڑھانا نہیں بلکہ درحقیقت (ضَعْفٌ) کم کرنا ہے۔ ربوا سے معاشرہ کی دولت کم ہوتی ہے اور سود خوار کی کمانے کی صلاحیتوں اور قوتوں میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس سے قومی معیشت بہت گھٹ جاتی ہے۔ بڑھتی نہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے لئے کسی دلیل اور شہادت کی ضرورت نہیں۔ ربوا سے افراد کی کمانے کی صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔ اور قومی دولت میں کمی آجاتی ہے۔

لیکن اگر اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً کے معنی "دو چند۔ سہ چند" بھی لئے جائیں تو بھی اس کا مطلب یہ نہیں ہو گا۔ کہ قرآن کریم صرف مرکب سود (ربوا) کو حرام قرار دیتا ہے۔ مفرد ربوا کو جائز ٹھہراتا ہے۔ قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ ممنوع چیزوں کی شدید ترین شکل کو سامنے لاکر ان سے باز رہنے کا حکم دیتا ہے۔ اس سے اس کا مقصد ان چیزوں کی ہر شکل سے اجتناب ہوتا ہے۔ مثلاً سورۂ حج میں ہے کہ وَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (۲۲/۳۰)۔ "تم بتوں کی گندگی سے بچو"۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم صرف بتوں کی گندگی سے بچو۔ باقی ہر قسم کی گندگی سے بے شک ملوث ہوتے رہو۔ یا سورۂ بقرہ میں ہے۔ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ ؕ (۲/۱۹۷)۔ حج میں فحش کلامی۔ گناہ کے کام۔ اور لڑائی جھگڑا مت کرو۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان باتوں سے صرف حج کے ایام میں باز رہو۔ سال کے باقی حصوں میں یا دوسرے مقامات پر یہ سب کچھ کرتے رہو۔ ظاہر ہے کہ بے حیائی اور گناہ کی باتیں بہرحال ناجائز ہیں۔ ان کی

قرآن کا انداز

کسی حالت اور کسی وقت میں بھی اجازت نہیں۔ قرآن نے حج کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا کہ ایسے اجتماع میں ان امور شنیعہ سے اجتناب اشد ضروری ہے یا اس لئے کہ اس زمانے میں لوگ حج کے اجتماع میں بھی ان باتوں سے باز نہیں آتے ہوں گے۔ دونوں صورتوں میں مفہوم یہ ہے کہ یہ باتیں ہر حال میں معیوب اور ناپسندیدہ ہیں۔ لیکن ان اجتماعات میں ان سے اجتناب اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ یہی صورت اضعافاً مضٰعفۃ کی ہے۔ یعنی ربوا تو ہر شکل میں ناجائز ہے۔ لیکن جب وہ مرکب سود کی شکل اختیار کر جائے تو وہ اور بھی زیادہ شدید طور پر خطرناک ہو جاتا ہے۔ اگر (جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے سمجھا ہے) ممانعت صرف سود مرکب کی ہوتی تو سورۂ بقرہ کی جس آیت میں کہا گیا ہے کہ اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لئے صرف اصل زر واپس لینا جائز ہے۔ وہاں یہ کہنا چاہیئے تھا کہ تم اصل زر کے ساتھ اتنا اور لے سکتے ہو۔ جتنا سود مفرد کے حساب سے بنتا ہے۔ اس سے مقروض پر ظلم نہیں ہو گا۔ لیکن قرآن نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے صرف اصل زر واپس لینے کی اجازت دی ہے۔ اس پر ایک پائی بھی زیادہ لی جائے گی تو وہ ظلم ہو گا۔ اسی طرح اس سے پہلی آیت میں جو اس نے کہا ہے کہ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا (۲۷۸/۲) "جو ربوا تم نے ابھی تک وصول نہیں کیا اسے چھوڑ دو" تو ڈاکٹر صاحب کے خیال کے مطابق کہنا یہ چاہیئے تھا کہ سود مفرد کے حساب سے جس قدر رقم بنتی ہے اسے مجرا لیکر بقایا چھوڑ دو۔ قرآن نے ایسا نہیں کہا۔ اس سے بھی واضح ہے کہ اس کے نزدیک مطلق ربوا حرام ہے۔

قرآن کی رو سے ربوا کے معنی ہوئے، اصل زر سے کچھ زیادہ لینا۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس زیادتی کا تعلق صرف قرض کے معاملات سے ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ یہ ایک جامع اصول ہے اور قرآنی نظام معیشت کی پوری عمارت اسی بنیاد پر اٹھتی ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا معاوضہ محنت (LABOUR) کا ہے یا سرمایہ (CAPITAL) کا بھی۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ (۳۹/۵۳)۔ انسان صرف اپنی محنت کے معاوضہ کا حقدار ہے۔ سرمایہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا معاوضہ طلب کیا جائے۔ لہٰذا لین دین کے جس معاملہ میں محنت کے بغیر محض سرمایہ کا معاوضہ لیا جائے خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ وہ ربوا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے حرام ہے۔ اور خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ کے مرادف۔ آپ غور کیجئے کہ ایک کاشتکار آپ سے ایک ہزار روپیہ قرض مانگتا ہے تاکہ وہ

معاوضہ کس چیز کا جائز ہے

ربوا کی مختلف شکلیں ایک قطعہ اراضی خرید کر اس میں کاشت کرے۔ اور اس کی آمدنی سے اپنا پیٹ بھی پالے اور آہستہ آہستہ آپ کا قرضہ بھی ادا کر دے۔ آپ اسے ایک ہزار روپیہ قرض نہیں دیتے۔ لیکن اسی روپے سے وہ قطعہ اراضی خرید کر اسے بٹائی یا پٹہ پر دے دیتے ہیں۔ وہ اس میں سال بھر محنت کر کے فصل بوتا ہے اور اس میں سے نصف پیداوار آپ لے جاتے ہیں۔ یہ ہر سال ہوتا ہے اور اس کے باوجود آپ کا قرض اس کے ذمہ بدستور باقی رہتا ہے۔ کیا یہ ربوا نہیں ؟

یا ایک دکان دار آپ سے کچھ قرض مانگتا ہے تاکہ وہ اس سے اپنے روزگار میں کچھ اضافہ کر سکے آپ اسے روپیہ دے دیتے ہیں لیکن بطور قرض نہیں بلکہ بطور حصہ دار۔ وہ دن رات کی محنت شاقہ سے کاروبار کرتا ہے لیکن اس کے منافع میں آپ برابر کے شریک ہو جاتے ہیں وہ آپ کو منافع کا حصہ دئے چلا جاتا ہے لیکن آپ کا اصل زر اس کے ذمہ بدستور باقی رہتا ہے۔ کیا یہ ربوا نہیں ؟

یا آپ اس کاروباری آدمی کو براہ راست قرض نہیں دیتے۔ آپ اپنا روپیہ بینک میں جمع کر دیتے ہیں اور بینک کے پاس محفوظ رہتا ہے۔ کیا یہ ربوا نہیں ؟ یہ سب ربوا ہے اور قرآن کی رو سے ناجائز خواہ اسے سود مفرد کے حساب سے شمار کیا جائے۔ یا سود مرکب کے حساب سے۔

جو کچھ ہم لیتے ہیں آپ غور کیجئے تو بادنیٰ التمق یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ جو کچھ ہم دوسروں سے لیتے ہیں اس کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً

(۱) عطیہ۔ اس میں نہ محنت کرنی پڑتی ہے نہ سرمایہ لگانا پڑتا ہے۔ دینے والا اسے واپس لینے کے خیال کے بغیر تحفۃً دیتا ہے۔ لہٰذا اسے لین دین کی مد میں شمار نہیں کیا جا سکتا یہی صورت اس "صدقہ" کی ہے جسے کسی ضرورت مند کی مدد کے لئے حسبۃً للہ دیا جاتا ہے۔ قرآن کی رُو سے وہ ضرورت مند اس امداد کو معاشرہ سے بطور اپنے حق کے طلب کر سکتا ہے۔ اس لئے اس میں بھی لین دین کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(۲) اُجرت۔ یہ محنت، کا معاوضہ ہوتا ہے اس میں سرمایہ کچھ نہیں لگایا جاتا۔

(۳) ربوا۔ اس میں دوسرے کو سرمایہ دیا جاتا ہے اور اس سرمایہ پر اصل سے زائد وصول کیا جاتا ہے سرمایہ دینے والا، محنت نہیں کرتا۔ بلکہ دوسرے کی محنت کا ایک حصہ وصول کر لیتا ہے۔

(۴) منافع (تجارت میں)۔ اس میں سرمایہ بھی لگایا جاتا ہے۔ اور محنت بھی کی جاتی ہے۔

(۵) قمار (جوا) اس میں نہ سرمایہ لگایا جاتا ہے نہ محنت کی جاتی ہے۔

(شقِ اوّل کو چھوڑ کر) آپ باقی شکلوں کو دیکھئے۔ جہاں معاوضہ محنت کا نہیں، اسے قرآن جائز قرار نہیں دیتا۔ اس کا اصول یہ ہے کہ معاوضہ محنت کا ہے۔

معاوضہ محنت کا ہے

چونکہ یہ اصول لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھا اس لئے ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ بیع کے منافع اور ربٰوا میں فرق کیا ہے؟ ایک شخص سو روپے کی چیز خرید کر ایک سو دس روپے میں بیچتا ہے اسے دس روپے اصل زر سے زائد وصول ہو جاتے ہیں۔ دوسرا شخص کسی کو سو روپیہ قرض دے کر اس سے ایک سو دس روپے وصول کرتا ہے اس سے اُسے بھی دس روپے اصل زر سے زیادہ ملتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ جب یہ دونوں، اصل زر پر زائد ہیں تو ان میں فرق کیا ہے؟ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوٓا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا (۲/۲۷۵)۔ وہ بیع اور ربٰوا کو ایک جیسا سمجھتے تھے۔ لیکن قرآن کریم نے کہا کہ یہ ان کی بھول ہے۔ یہ دونوں ایک نوعیت کا معاملہ نہیں۔ بیع میں سرمایہ اور محنت دونوں صرف ہوتے ہیں۔ سرمایہ کے بدلے میں سرمایہ واپس آجاتا ہے۔ اور دکان دار کو اس کی محنت کا معاوضہ، سرمایہ کے علاوہ ملتا ہے۔ یہ حلال ہے کیونکہ یہ اس کی محنت کا معاوضہ ہے۔

بیع اور ربٰوا میں فرق

لیکن ربٰوا میں صرف سرمایہ لگتا ہے۔ محنت کچھ صرف نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس میں جو کچھ زائد ملتا ہے وہ سرمایہ کا معاوضہ ہے۔ جو حرام ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم کی رو سے اصول یہ ہے کہ

(۱) محنت کا معاوضہ لینا حلال ہے۔ اور

(۲) سرمایہ پر زائد لینا حرام۔

اگر تجارت میں بھی کوئی شخص، اپنی محنت سے زائد منافع لیتا ہے تو وہ ربٰوا ہے کیونکہ یہ سرمایہ کا معاوضہ ہوگا۔ محنت کا نہیں۔ اس بات کا یقین معاشرہ کرے گا کہ اس شخص کی محنت کا معاوضہ کیا ہونا چاہیئے۔ وہ اس معاوضہ سے زیادہ منافع نہیں لے سکتا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بیع (تجارت) میں النسان (RISK) لینا ہے۔ یعنی اس میں نفع اور نقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ اور ربٰوا میں (RISK) نہیں ہوتا۔ لیکن حلت اور حرمت کے لئے یہ معیار تفریق صحیح نہیں۔ اگر کسی آمدنی کو حلال قرار دینے کی شرط (RISK) ہی ہو تو جوا عین حلال ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اس میں تو ہر داؤ میں (RISK) ہوتا ہے۔ بیع اور ربٰوا میں فرق وہی ہے جسے اوپر بیان کیا گیا ہے۔ بیع میں راس المال + محنت کا معاوضہ واپس ملتا ہے اور ربٰوا میں راس المال +

راس المال کا معاوضہ ملتا ہے۔ محنت کا معاوضہ حلال ہے۔ راس المال کا معاوضہ حرام۔

دشواریاں کیوں پیش آتی ہیں

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی رو سے ربوا کا مسئلہ کس قدر آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس میں جو دشواریاں آج کل پیش آرہی ہیں، ان کی وجہ یہ ہے کہ

(۱) ربوا کی بہت سی شکلیں ایسی ہیں جنہیں قرآن کریم حرام قرار دیتا ہے لیکن (بد قسمتی سے) ہماری مروجہ شریعت اسے حلال قرار دیتی ہے۔ (مثلاً زمین کی بٹائی یا مضاربت یعنی کاروبار میں ایسی شراکت جس میں ایک پارٹی محض سرمایہ پر منافع وصول کرتی ہے۔ یا تجارت میں جس قدر بھی منافع لیا جاسکے وغیرہ) ہمارے ارباب شریعت اسے برداشت ہی نہیں کرسکتے کہ وہ اپنی غلطی کو تسلیم کرلیں۔ اس لئے وہ ربوا کی تعریف ایسی کریں گے جس کی رو سے یہ شکلیں ربوا کی شق میں نہ آسکیں۔

(۲) سرمایہ دارطبقہ، بلا محنت روپیہ حاصل کرنے کا اس قدر خوگر ہوچکا ہے کہ محنت کے تصور سے انہیں پسینہ آجاتا ہے۔ اس لئے وہ ربوا کے قرآنی تصور کی طرف آنا ہی نہیں چاہتے۔

(۳) اور سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ ہمارا موجودہ معاشی نظام غیر قرآنی ہے۔ بجائے اس کے کہ

پیوندسازی سے کام نہیں چلے گا

ہم اس نظام کو قرآنی نظام سے بدلیں، چاہتے یہ ہیں کہ اس میں پیوند لگا کر اپنے آپ کو دھوکا دے لیں کہ یہ قرآنی ہوگیا ہے۔ لیکن وہ پیوند، اصل کے ساتھ فٹ نہیں بیٹھتا۔ اس لئے ہم کوشش یہ کرتے ہیں کہ اس میں کچھ کتر بیونت کرکے اسے کسی نہ کسی طرح اصل کے ساتھ چپکا دیا جائے۔ لیکن یہ کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ قرآنی نظام ایک غیر منقسم وحدت ہے۔ اس میں غیر قرآنی پیوند کبھی فٹ بیٹھ ہی نہیں سکتا۔ قرآن کے معاشی نظام کی رُو سے:-

(ا) زمین ذریعہ رزق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے (ہوا، پانی، روشنی کی طرح) نوع انسان کی پرورش کے لئے بلا مزد و معاوضہ عطا کیا ہے۔ اس پر ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اُمت کی تحویل میں رہے گی تاکہ وہ اس سے تمام افراد کو رزق پہنچانے کا انتظام کرے۔ زمین سے مراد ہے ہر وہ چیز جو زمین سے برآمد ہو۔ اس میں اناج اور مصنوعات کے لئے خام مسالہ سب آجاتے ہیں۔

(ب) اس نظام میں کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت (SURPLUS MONEY) رہ نہیں سکتی۔ اس لئے افراد کے لئے جائدادیں کھڑی کرنے یا ویسے ہی روپیہ (INVEST) کرنے کا سوال

پیدا نہیں ہوتا۔

(ج) اس میں تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری نظام پر عائد ہوتی ہے۔ اس لئے کسی کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے کسی کا دستِ نگر نہیں ہونا پڑتا۔ لہٰذا اس میں سودی لین دین کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(د) حتیٰ کہ اس میں انفرادی تجارت کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اس میں دکاندار اشیائے ضروریات تقسیم کرنے کی ایجنسی ہوگا۔ اسے نفع اندوزی کا ذریعہ نہیں بنایا جائے گا۔ اس کی محنت کا معاوضہ نظام کی طرف سے ملے گا آپ نے غور فرمایا کہ اس نظام میں ربوا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا حقیقت

دو متضاد نظام

یہ ہے کہ ربوا سود کا نام نہیں۔ یہ ترجمان ہے اس معاشی نظام کا جو قرآن کے معاشی نظام کی یکسر ضد ہے۔ قرآنی نظام میں ہر فرد زیادہ سے زیادہ محنت کر کے کم از کم اپنے پاس رکھ کر زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دیتا ہے۔ غیر قرآنی نظام میں، ہر فرد کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ محنت دوسرے کریں اور اسے بلا محنت زیادہ سے زیادہ ملتا جائے۔ یہ دونوں نظام اس قدر ایک دوسرے کی ضد ہیں کہ قرآن نے اس نظام کو "خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ" قرار دیا ہے۔ یہ نظام فی الواقعہ قرآنی نظام سے بغاوت ہے۔ اب اس کے بعد آپ سوچئے کہ کیا یہ کسی طرح ممکن ہے کہ ہمارا نظام تو غیر قرآنی رہے اور ہم اس کے اندر رہتے ہوئے ربوا کے مسئلہ کا کوئی اطمینان بخش حل تلاش کر لیں۔ اس قسم کی کوشش ہم نے اس سے پہلے اپنے جاگیرداری اور زمینداری دور (عہدِ عباسیہ) میں کی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے زمین کی بٹائی۔ مضاربت۔ تجارت میں غیر محدود منافع وغیرہ کو جائز قرار دے کر اپنے آپ کو فریب دے لیا۔ جو کوشش اب ہو رہی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم بینکوں کے سود یا صنعتی اداروں کے سود یا صنعتی اداروں کے حصوں پر منافع وغیرہ کو جائز قرار دے کر اپنے آپ کو فریب در فریب میں مبتلا کر لیں گے۔

بینکوں کے سود کی مخالفت

بینکوں کے سود وغیرہ کے سلسلے میں اس وقت جو مخالفت قدامت پرست طبقہ کی طرف سے ہو رہی ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ حضرات اسے اسلامی نظامِ معیشت کے خلاف پاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بینکوں کے سود کا مسئلہ اس وقت موجود نہیں تھا جب ہماری فقہ مرتب ہوئی ہے اسے اب "جائز" کی فہرست میں داخل کرنا ان کے نزدیک "بدعت" ہے۔ اگر یہ شکل اس وقت موجود ہوتی تو جس طرح زمین کی بٹائی اور مضاربت وغیرہ جائز قرار دے دی گئی تھیں، ممکن ہے یہ بھی اسی فہرست میں شامل ہو جاتا۔ بینک کا سود تو بٹائی وغیرہ کے مقابلے میں استحصال (EXPLOITATION) کی بہت

نرم شکل ہے۔

اشتراکیت کی آڑ

لیکن اس سلسلے میں سب سے بڑی دشواری ایک اور ہے اور وہ یہ کہ ہمارے زمانے میں اشتراکیت (کمیونزم) نے ایک ایسے نظام کی طرح ڈالی ہے جو نظام سرمایہ داری کی ضد ہے۔ اور چونکہ قرآنی نظام بھی سرمایہ داری کی ضد ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اشتراکی نظام اور اسلامی نظام کی بعض جزئیات کی باہمی مماثلت (یعنی ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہونا) فطری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اشتراکی فلسفۂ زندگی اسلامی فلسفۂ حیات کی ضد ہے[1]۔ اس چیز کو ہمارا قدامت پرست مذہبی طبقہ ایک موثر حربہ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ:۔

(۱) مذہبی پیشوائیت اور نظام سرمایہ داری کا گٹھ جوڑ شروع سے چلا آرہا ہے۔ مذہبی پیشوائیت بجائے خویش، نظام سرمایہ داری ہی کی ایک شاخ ہے۔ نظام سرمایہ داری کی اصل و بنیاد یہ ہے کہ محنت کئے بغیر دولت حاصل ہو جائے۔ محنت نہ مذہبی پیشوا کرتے ہیں نہ سرمایہ دار، سرمایہ دار تو پھر بھی روپیہ لگا کر روپیہ حاصل کرتے ہیں۔ مذہبی پیشوا بغیر روپیہ لگائے دوسروں کی کمائی بٹور لیتے ہیں۔ یہ سرمایہ داری کی شدید ترین شکل ہے۔ لہٰذا مذہبی پیشوائیت کی طرف سے قرآنی نظام معاشی کی مخالفت فطری امر ہے۔

(۲) لیکن ان میں اتنی جرأت ہے نہیں کہ یہ کھلے بندوں قرآنی نظام کی مخالفت کریں۔ نہ ہی ان کے پاس ایسے دلائل ہیں جن کی رو سے یہ اس نظام کو خلاف اسلام قرار دے سکیں۔ لہٰذا، یہ کرتے یہ ہیں کہ

(۳) جوں ہی کسی نے قرآن کے معاشی نظام کا ذکر کیا انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ یہ کمیونسٹ ہے۔ اور چونکہ (جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے) قرآنی نظام اور اشتراکی نظام کی بعض جزئیات میں مماثلت ہے اس لئے عوام اور سطح بین پڑھے لکھے لوگ۔ فوراً ان کے فریب میں آجاتے ہیں۔ اور ایسا کہنے والے کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے اس پراپیگنڈے کا اثر یہاں تک پہنچ گیا

---

[1] اس نکتہ کی وضاحت طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت باب المراسلات میں ایک خط کے جواب میں کی گئی ہے۔ اسے دوبارہ دیکھ لیا جائے۔

ہے کہ سینے میں دردمند دل رکھنے والے لوگ یہ کہتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں کہ ملک میں بھوک اور افلاس کا علاج ہونا چاہیئے کہ مبادا وہ کمیونسٹ نہ ٹھہرا دئے جائیں۔ قرآنی نظام کی مخالفت کے لئے، مذہبی پیشوائیت کا یہ حربہ بڑا کارگر ثابت ہو رہا ہے۔ عوام کی نگاہیں ظاہر بیں ہوتی ہیں۔ انہیں یہ سمجھانا مشکل ہوجاتا ہے کہ اسلام کے معاشی نظام اور اشتراکیت کے معاشی نظام کی بعض جزئیات میں مماثلت ہے ان جزئیات کو پیش کرنے والا ضروری نہیں کہ اشتراکی ہو۔ وہ سچا مسلمان بھی ہوسکتا ہے۔ بنیادی فرق، اسلام کے فلسفۂ زندگی اور اشتراکی فلسفۂ حیات میں ہے۔ اشتراکی فلسفۂ حیات کا ماننے والا بیشک مسلمان نہیں ہوسکتا۔ اگر اسلام کے معاشی نظام اور اشتراکیت کے معاشی نظام کے کسی جز کا باہمدگر مماثل ہونا، اسلامی نظام کے پیش کرنے والے کو کمیونسٹ بنا دیتا ہے تو اس اعتبار سے ہمارے تمام علمائے کرام کمیونسٹ ہیں۔ اس لئے کہ کمیونزم میں بھی سود ناجائز ہے اور یہ حضرات بھی سود کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ اس سے یہ حضرات تو کمیونسٹ قرار نہیں پاتے لیکن اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی تو وہ ان حضرات کے نزدیک فوراً کمیونسٹ قرار پا جائے گا۔ اس لئے نہیں کہ زمین پر ذاتی ملکیت کی نفی اسلام کے خلاف ہے۔ بلکہ اس لئے کہ یہ حضرات اس پر ذاتی ملکیت کو جائز سمجھتے ہیں۔

یہ ہے وہ سب سے بڑی دشواری جو اس وقت ان مسائل کے صحیح حل کے راستے میں حائل ہو رہی ہے۔

اسلام اور اشتراکیت

اگر اسلام اور اشتراکیت کے نظریہ ہائے حیات کے فرق کو پیشِ نظر رکھ کر ان کے معاشی نظاموں کا مطالعہ کیا جائے تو بات بالکل صاف ہوجاتی ہے علامہ اقبال رح نے جب سر فرانس ینگ ہسبینڈ کو لکھا تھا کہ

اشتراکیت کا معاشی نظام + خدا = اسلام

تو اس سے ان کی یہی مراد تھی اور جب انہوں نے قائداعظم سے کہا تھا کہ ہندو اگر اشتراکی نظام معیشت کو اپناتا ہے تو اسے ہندومت سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ لیکن اگر مسلمان اسے اپناتا ہے تو اس کا یہ اقدام اس خالص اسلام کی طرف جانے کے مرادف ہوگا جو چودہ سو سال پہلے ظہور میں آیا تھا۔ تو اس سے بھی ان کا یہی مطلب تھا۔

معاشی نظام اور فلسفۂ زندگی کے فرق کو نظرانداز کر دینے کا نتیجہ ہے کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کو یہ کہنا پڑا کہ

اگر ہم نے اشتراکی نظام معیشت اختیار کیا تو اس کی پابندیاں اور اس کا جبر بھی قبول کرنا ہوگا جس کے لئے شاید ہم میں سے اکثر تیار نہ ہوں۔

یہ "جبر" اشتراکی فلسفۂ زندگی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر اس نظام کو اسلامی فلسفۂ زندگی کے تابع اختیار کیا جائے تو اس میں جبر و استبداد کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔ اس کی عمارت انسانی ذات، اسے نشوونما دینے والی مستقل اقدار، قانون مکافاتِ عمل اور اُخروی حیات پر ایمان کی بنیادوں پر اٹھتی ہے

اسلام میں جبر نہیں

اور ایمان میں جبر و اکراہ کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ وہ دل کی گہرائیوں سے اُبھرتا ہے۔ اسی ایمان کے تصور کا فقدان ہے، جس سے اشتراکیت اور جبر و تشدد لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔ اشتراکیت + خدا کے معنی یہ ہیں کہ اس معاشی نظام کو وحیٔ خداوندی کی بنیادوں پر استوار اور ایمان کے ذریعہ قبول اور اختیار کیا جائے۔ اس سے وہ "جذبۂ صدقہ" اور "جذبۂ معاونت" پیدا ہوتا ہے جسے ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب نے نظامِ سرمایہ داری کو کالعدم کرنے کے لئے بنیادی شرط قرار دیا ہے۔

کرنے کا کام

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کی روشنی میں ہمارے نزدیک" ہمارے معاشی مسائل کے حل کا طریق یہ نہیں کہ کبھی ملکیت زمین کے سوال کو زیر بحث لے آئے اور کبھی بینک کاری پر گفتگو کرنے لگ گئے اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ متعین کیا جائے کہ اسلام کا معاشی نظام ہے کیا۔

یہ کام ہمارے قدامت پرست طبقہ کے بس کا نہیں۔ اس لئے کہ

(۱) ان کے نزدیک وہ معاشی نظام جو عباسی ملوکیت کے زمانے میں مرتب ہوا تھا عین اسلامی نظام ہے۔

(۲) ان کی ذہنیت یہ قرار پا چکی ہے کہ جو بات اسلام کے نام سے متعارف ہو کر چلی آرہی ہے اس پر نظرِ ثانی نہیں کی جا سکتی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ

(۳) ان کے نزدیک قرآن کریم، دین میں واحد اور آخری سند نہیں۔

یہ کام ان لوگوں کے کرنے کا ہے جو قرآن کریم کو آخری سند اور حجت تسلیم کریں اور عصر حاضر کے اقتصادی تقاضوں پر ان کی نگاہ ہو۔

جب اس طرح، پہلے یہ متعین ہو جائے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے تو اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ ہم اپنے موجودہ نظام سے، اسلامی نظام تک کس طرح تدریجاً پہنچ سکتے ہیں۔ یعنی پہلے منزل کا تعین کر لیا جائے اور اس کے بعد اس تک بتدریج پہنچنے کے طرق و وسائل پر غور کر کے چلنا شروع کر دیا جائے[۱]۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ اسلامی نظام۔ اس کی حکمتِ بالغہ۔ اس کی انفرادیت اور اس کے بے مثل و بے نظیر ہونے کے دعوے کی صداقت کو تعلیم کے ذریعہ آنے والی نسلوں کے دل و دماغ میں اس طرح جاگزیں کیا جائے کہ اس کا مطالبہ ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے اور وہ اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے اس طرح مضطرب و بیتاب ہوں جس طرح مچھلی پانی میں جانے کے لئے بیقرار ہوتی ہے۔

اگر ایسا نہ کیا گیا اور ہم ان مسائل کو فرداً فرداً لے کر انہیں اسی طرح بحث و نظر کا موضوع بناتے رہے جس طرح اب تک بناتے چلے آ رہے ہیں تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ ہم اپنے وقت اور توانائیوں کو ضائع کرتے رہیں۔ ان لوگوں کی طرح جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ فحبطت اعمالھم فلا نقیم لھم یوم القیمۃ وزنا ..... یحسبون انھم یحسنون صنعا۔ ($\frac{18}{105-104}$)۔ اور اصل مسئلہ جوں کا توں رہے۔ بینک کے سود کے مسئلہ ہی کو لیجئے۔ اگر آپ اس سود کو جائز قرار دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ

آپ "بے محنت کی کمائی" کی اُس فہرست میں ایک اور شق کا اضافہ کر دیتے ہیں جو قرآنی اصولِ معیشت کے علی الرغم ہمارے ہاں پہلے سے رائج چلی آ رہی ہے۔ مثلاً زمین کی پیداوار کی بٹائی مضاربت وغیرہ۔ اور اگر آپ بٹائی۔ مضاربت وغیرہ کو جائز رکھ کر بینک کے سود کو ناجائز قرار دیتے ہیں تو آپ کا بینکنگ سسٹم ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ سرمایہ دار طبقہ اپنا روپیہ بینک کے کاروبار میں لگائے گا ہی نہیں۔ لیکن اگر آپ قرآن کا معاشی نظام اختیار کر لیتے ہیں تو اس میں اس قسم کی کوئی مشکل پیش ہی نہیں آئے گی۔ اس وقت افراد کے پاس فالتو دولت (SURPLUS MONEY) رہے گی ہی

---

[۱] آپ نے دیکھا ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون کے ماحصل میں جو کچھ کہا ہے وہ اصولی طور پر وہی ہے جسے ہم نے اپنے اس تبصرہ میں پیش کیا ہے۔ یعنی صدقہ اور معاونت کے اسلامی جذبات کو ابھار کر نظامِ سرمایہ داری کو تدریجاً کالعدم کر دینا۔

نہیں جو اس پر نفع کمانے کا سوال پیدا ہو۔ دولت، ملت کی تحویل میں رہے گی اور وہیں سے تمام ضرورتمندوں کی ضروریات پوری ہوتی رہیں گی۔ ان ضرورت مندوں کی احتیاج سے فائدہ اٹھا کر نفع کمانے کا تصور تک بھی باقی نہیں رہے گا۔

یہ ہے اس مسئلہ کا اصلی حل۔

حدیث کی صحیح پوزیشن

ربوا کے متعلق بحث تو ختم ہو گئی۔ لیکن ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کے مضمون میں حدیث کے متعلق ایسی تصریحات آگئی ہیں جن کے متعلق مختصر سی گفتگو ضروری ہے۔ حدیث کے متعلق بنیادی طور پر یہ کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں جو باتیں (ان حضرات کے خیال کے مطابق) مجملاً بیان ہوئی ہیں۔ حدیث سے ان کی تفصیل معلوم ہو جاتی ہے۔ ربوا کے متعلق ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کی تفصیل تو ایک طرف، کوئی جامع اور مانع تعریف بھی قرآن کریم میں نہیں ملتی۔ اور اس کے لئے حدیث کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں تفصیلی بحث کے بعد ڈاکٹر صاحب جس نتیجہ تک پہنچے ہیں وہ حسب ذیل ہے:۔

صحیح احادیث کے ذخیرے میں ربوا کے بارے میں جو شدید معارضے کی صورتیں اور ناقابلِ حل الجھنیں پائی جاتی ہیں ان کے پیش نظر ربوا کی کوئی جامع اور مانع تعریف کی کوشش کرنا یقیناً ایک بڑا حوصلہ مندانہ اقدام ہے۔

آپ غور کیجئے کہ ربوا کو "خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ" کہا گیا ہے۔ لیکن ربوا ہے کیا، اس کی تعریف تک (بقول ان حضرات کے) نہ قرآن سے ملتی ہے نہ احادیث سے۔ فرمائیے کہ ان خیالات کے مطابق دین پر عمل کرنے کی کوئی صورت بھی ممکن ہے۔

۲۔ احادیث خود ایک دوسرے سے کس قدر متعارض ہیں۔ ان کے متعلق ڈاکٹر صاحب بار بار شکایت کرتے ہیں مثلاً وہ لکھتے ہیں۔

روایات کے اس شدید معارضے کے علاوہ اور بھی کئی وجہیں ایسی ہیں جن سے حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کردہ اثر کو رد کرنا ضروری ہے۔

دوسری جگہ لکھا ہے :

ایسا نظر آتا ہے کہ کسی ابتدائی مرحلہ پر یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ ربوا کے بارے میں قرآن کی تصریحات نامکمل ہیں جن کی تکمیل احادیث کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ مندرجہ بالا آثار شاید اس جذبہ کے ابتدائی مظاہر ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان آثار کی طرح ربوا کے سلسلہ کی فقہی حدیثوں میں بھی شدید معارضہ ہے۔

حدیثوں کے اس باہمی معارضہ کی علت کے متعلق ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ

اگر اس طریق پر ان احادیث کا جائزہ لیا جائے تو ان میں ایک واضح "ارتقائی عمل" نظر آنے لگتا ہے "ارتقائی عمل" سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا گیا خود نبی اکرمؐ اپنے سابقہ ارشادات میں تبدیلیاں فرماتے گئے۔ لیکن ایسا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب اس سلسلے میں کچھ اور لکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مضمون میں اس عمل ارتقا کی ایک مثال پیش کی ہے۔ اور وہ یہ کہ (۱) تیسری صدی ہجری کے ایک لغوی اور نحوی (زجاج) نے ربوا کی ایک تعریف پیش کی۔ ازاں بعد اس تعریف نے خود حدیث کی شکل اختیار کر لی۔ (۲) چوتھی صدی ہجری تک اس حدیث کا نام و نشان نہیں ملتا۔ یکایک پانچویں صدی ہجری میں بیہقی کی سنن میں یہ حدیث نظر آجاتی ہے لیکن اس کی شکل غیر واضح سی تھی۔ اور روایت کا سلسلہ رسول اللہؐ تک نہیں پہنچتا تھا (۳) دسویں صدی میں سیوطی رح کی جامع الصغیر میں یہ حدیث متعین شکل میں سامنے آجاتی ہے۔ اور اس کا سلسلۂ روایت بھی رسول اللہ تک جا پہنچتا ہے۔ لیکن امام سیوطی رح نے اسے ضعیف لکھا ہے۔ دسویں صدی کے اواخر میں یہ حدیث کنز العمال میں ضعیف بھی نہیں رہتی۔ گیارہویں صدی میں مصری عالم العزیزی نے اسے "حسن لغیرہ" قرار دے دیا۔ اور (۴) اب چودھویں صدی میں مفتی محمد شفیع صاحب نے فتویٰ صادر فرما دیا ہے کہ "یہ روایت محدثین کے نزدیک صالح للعمل ہے"۔

یہ ہے حدیث میں "عمل ارتقا"۔

ڈاکٹر صاحب کا مسلک

احادیث کے متعلق اس تحقیق کے بعد آپ سمجھتے ہوں گے کہ ڈاکٹر صاحب یہ کہیں گے کہ اس قسم کی چیزیں کبھی قابل اعتماد نہیں ہو سکتیں انہیں مسترد کر دینا چاہیئے۔ لیکن آپ غلط سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب یہ نہیں کہتے۔ وہ کہتے ہیں کہ

الغرض احادیث کی روشنی میں ربوا کی تعریف کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ تو

کیا اس باب میں تمام احادیث کو یکسر رد کر دیا جائے؟ کیا ان سے انکار کر دیا جائے؟
ہمارا جواب قطعاً نفی میں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان فقہی احادیث میں ارتقائی عمل جس کے کرشمے ہم نے صفحات ماسبق پر دیکھے ہیں۔ ان کے استناد کو مشکوک اور مشتبہ بنا دیتا ہے لیکن ان کے راویوں اور جامعوں کے ساتھ سوءِ ظن رکھنا اور ان کی کوششوں کو رد کر دینا سخت نادانی ہوگی۔

سوال یہ ہے کہ اگر اس قسم کی احادیث کو رد نہ کیا جائے تو ان کے متعلق کیا سمجھا جائے؟ کیا یہ سمجھا جائے کہ یہ واقعی رسول اللہؐ کے ارشادات ہیں اور دین میں سند اور حجت؟ یا للعجب!

تبصرہ بر تبصرہ

حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر فضیلت حاصل ہونے اور ان کے مسجودِ ملائک بننے کی وجہ قرآن حکیم کے نزدیک یہ ہے کہ انہیں علم الاسماء حاصل تھا جب کہ فرشتے اس سے محروم تھے۔ افسوس یہ کہ اولاد آدم اس میراثِ پدری کو بھلا کر "فرشتہ" بننے پر مصر رہی ہے۔ دنیا کے فتنہ و فساد کی جڑ اکثر یہ ہوتی ہے کہ متکلم، سامع، اسمائے ملفوظہ اور ان کے مدلولات میں صحیح رشتہ قائم نہیں ہوتا۔ SEMANTICS کے اس خلفشار کی تازہ ترین مثال ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کے مقالہ "تحقیقِ ربٰوا" پر بحث کی شکل میں نمایاں ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس خطرہ کے پیشِ نظر بہت واضح لفظوں میں مقالے کے شروع ہی میں یہ نوٹ درج کر دیا تھا کہ

> "فارسی زبان کا لفظ 'سود' قرآنی اصطلاح ربٰوا کا مترادف نہیں ہے۔ اس فارسی لفظ کے لغوی معنی 'نفع' ہیں، جس کا ضد 'زیاں' ہے اور جس کا عربی مترادف 'ربح' ہے۔ اس مقالے میں ربٰوا کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن قرآن کے اصطلاحی ربٰوا کا اردو، فارسی یا کسی اور عجمی زبان میں ترجمہ کرنا راقم الحروف کے نزدیک نہ صرف سعی لاحاصل ہے بلکہ بنائے باطل بھی ہے۔"

اس واضح نوٹ کے بعد سود، سود در سود، سود مرکب اور سود مفرد کی بحث کی ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کے مقالے کے سلسلے میں ہرگز کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔ لیکن خدا بھلا کرے فرشتوں کا، ان کی پیشین گوئی کے برے اثرات سے بچنا آسان تو نہیں۔ بچپن سے سود مرکب اور سود مفرد کے سوالات ایسے سر پر سوار

ہوتے ہیں کہ ربوا کی بحث میں ان سے خلط مبحث کرتے ہیں مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی ہوں یا چودھری غلام احمد صاحب پرویز برابر کے شریک نظر آنے لگتے ہیں۔ چنانچہ محترم پرویز صاحب نے اپنے تبصرہ کی بنیاد ہی اس خیال پر رکھی ہے کہ ڈاکٹر صاحب

"اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ قرآن نے صرف (مروجہ الفاظ میں) سود در سود (یا سود مرکب) کو حرام قرار دیا ہے۔ سادہ سود کو نہیں"

اس مروجہ غلط فہمی پر بنیاد رکھنے کا جو نتیجہ ہونا تھا وہ صفحات بالا میں قارئین کرام کے سامنے ہے۔

آگے چل کر محترم پرویز صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ

"قرآن کی رو سے ربوا کی جامع اور مانع تعریف ان چار الفاظ کے اندر موجود ہے جو سورۂ بقرہ کی آیت ۲۷۹ میں آئے ہیں اور جنہیں ڈاکٹر صاحب نے بھی درج کیا ہے، یعنی

وان تبتم فلکم رؤس اموالکم — اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لئے تمہارا راس المال ہے"

آیت محولہ بالا کے چار (۹) الفاظ کو ربوا کی جامع و مانع تعریف قرار دینا ہمیں حیرت انگیز امر نظر آتا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ اس "جامع و مانع تعریف" کو بنیاد قرار دیکر پرویز صاحب یہ اصول متعین کرتے ہیں کہ

"قرآن کی رو سے ربوا کے معنی ہوئے اصل زر سے کچھ زیادہ لینا۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس زیادتی کا تعلق صرف قرض کے معاملات سے ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ یہ ایک جامع اصول ہے اور قرآنی نظام معیشت کی پوری عمارت اسی بنیاد پر اٹھتی ہے۔"

ربوا کے قرآنی مفہوم کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے مقالہ میں طویل بحث کی ہے اور قرآن حکیم کے اپنے واضح الفاظ، تحریم ربوا کی آیتوں کی تنزیل کی تاریخی ترتیب اور جاہلی ربوا کی حقیقت کے بارے میں تاریخی شہادتوں کے پیش نظر انہوں نے اس کی تعریف پیش کی ہے۔ پرویز صاحب نے ان سب سے قطع نظر کر کے قرآنی الفاظ لاتاکلوا الربوا اضعافا مضاعفۃ کے معنی میں شک ڈالنے کے لئے امام راغب اصفہانی کا ایک قول نقل کر دیا ہے جسے آگے چل کر انہوں نے خود ہی ترک بھی کر دیا ہے۔

یہاں گنجائش نہیں ہے کہ ہم ڈاکٹر صاحب کی اس بحث کو دہرائیں۔ علاوہ ازیں محترم پرویز صاحب سے اُن خطوط پر گفتگو کرنا سراسر غیر مفید بھی ہے اس لئے کہ وہ تاریخی شہادتوں اور روایات کے سرے سے قائل ہی نہیں۔ لیکن محض قرآن حکیم کے اپنے سیاق و سباق ہی کو مد نظر رکھا جائے تب بھی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ

پرویز صاحب کے یہ دونوں دعوے کہ (۱) آیت وان تبتم فلکم رؤس اموالکم ربوا کی جامع و مانع تعریف ہے اور (۲) ربوا کا تعلق صرف قرض کے معاملات سے نہیں ہے، باطل ہیں۔

زمانۂ جاہلیت میں ربوا کا ایک خاص نظام تھا جس کی خصوصیت کو واضح کرتے ہوئے قرآن نے اس سے منع کیا اور فرمایا کہ لا تاکلوا الربوا اضعافا مضاعفۃ۔ جب جاہلیت کے ربوا کو قرآن نے حرام قرار دیا تو اسے ترک کرنے کے بعد تو سوال صرف یہ رہتا تھا کہ قرض خواہ مقروض سے اپنا اصل زر بھی واپس لے یا نہ لے۔ قرآن نے اصل زر واپس لینے کی اجازت یہ کہہ کر دی کہ وان تبتم فلکم رؤس اموالکم (اگر تم توبہ کر لو تو راس المال تمہارا ہے) لیکن قرآن کی نگاہ میں یہ بھی ایک رعایت تھی کیونکہ وہ تو دراصل نظام صدقہ کا داعی ہے۔ اسی لئے اس نے اسی سلسلۂ آیات میں آگے چل کر کہا ہے کہ وان تصدقوا خیر لکم (اور اگر تم راس المال بھی صدقہ کر دو تو تمہارے لئے بہتر ہے)

بات اتنی سیدھی سی ہے لیکن پرویز صاحب وان تبتم فلکم رؤس اموالکم کو ربوا کی جامع و مانع تعریف قرار دیکر اسے الجھا رہے ہیں۔ حالانکہ اگر یہ آیت ربوا کی تعریف ہو سکتی ہے تو اس سے اگلی آیت وان تصدقوا خیر لکم اس شرف سے کیوں محروم رہے؟

پرویز صاحب نے زیادہ تر اشتراکی نظام معیشت کی حمایت پر صرف کی ہے۔ حالانکہ اس کا یہاں کوئی موقع نہ تھا۔ یہ ساری بحث غیر متعلق ہے بالخصوص اس لئے کہ جیسا کہ ڈاکٹر صاحب اپنے مقالے میں واضح کر چکے ہیں، اشتراکی ممالک بھی بینک اور ان کے سودی کاروبار کو روا رکھتے ہیں۔

حدیث کی "پوزیشن" کے بارے میں پرویز صاحب کے ارشادات کے لئے ڈاکٹر صاحب کا وہ مضمون ملاحظہ کیجئے جو "پرویز صاحب کی خدمت میں ایک گذارش" کے عنوان سے شامل اشاعت ہے۔